قرآن کی دعوت

تفکّر و تعقل کی دعوت ہے

ڈاکٹر سیّد محمدّ یوسف صدر شعبہ عربی، کراچی یونیورسٹی

ڈاکٹر سید محمدّ یوسف صاحب نے مشہور مسلمان فلسفی ابن طفیل کی تصنیف حیّ بن یقظان کا عربی سے اُردو میں ترجمہ کیا ہے، جسے انجمن ترقّیٔ اُردو پاکستان نے شائع کیا ہے، کتاب کے شروع میں ڈاکٹر صاحب نے "اسلام میں عقل، نقل اور کشف" کے عنوان سے تبصرہ رقم فرمایا ہے، جس میں اُنہوں نے تفصیل سے بتایا ہے کہ اسلام ایک ذہنی انقلاب کا حامل تھا۔ اور قرآن نے انسان کی فطری عقل کو اپنا مخاطب بنایا تھا۔ مندرجہ ذیل اقتباس اسی "تبصرہ" میں سے ہے، (مدیر)

عقل، نقل اور کشف معرفت کے یہ تین وسائل ہیں، جن کے آپس کے تعلق، موافقت یا تضاد کی بابت مختلف رایوں کی کش مکش مختلف ادوارِ تاریخ میں مسلمانوں کی ذہنی، علمی اور سماجی زندگی میں عجیب عجیب لیکن ہمیشہ گہرے بنیادی انداز سے کارفرما رہی ہے۔ اسلام اور پیغمبرِ اسلامؐ نے ابتداء ہی سے انسان کو سمجھ بوجھ کا اہل قرار دیا، بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ سمجھ داری کا احساس اُس کے اندر بیدار کیا اور اس احساس کی بیداری ہی کو اپنی مقبولیت اور کامیابی کی کلید بنایا۔

کیا وجہ ہے کہ اسلام کا آغاز "یدِ بیضا" اور "طفلِ گہوارہ" کے کلام کی بجائے "اِقْرَأْ" سے ہوا، تفکّر و تعقل کی دعوت 'اولی الالباب' سے بھروسہ اور اُمید کے ساتھ خطاب، تقلیدِ آباء اور جہل کی کالانعام بل هم اضلّ سے بیزاری اور روگردانی قرآن کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ اور پھر کیا مختلف ادیان کی تاریخ میں یہ بات بے نظیر نہیں کہ اصل پیغام کو توجہ کا مرکز اور اسی کو حقانیت کا معیار قرار دیا جائے؟

قرآن کے اعجاز کو الفاظ، ترکیبوں اور بندشوں تک محدود رکھنا ایسا ہی ہے جیسے "یٰسین" سے

آسان مرگ طلب کرنا۔ محمد صلعم نے شاعروں کو نیچا دکھانے کے لئے شاعری کا کوئی دوسرا نمونہ، کاہنوں کو لاجواب کرنے کے لئے کہانت کی کوئی بہتر مثال اور سانپوں کے مقابلے میں اژدہا پیش نہیں کیا، بلکہ ہر سوال کے جواب میں "صاف سمجھ میں آنے والی کتاب" (کتابٌ مبین) پیش کی۔ قرآن کا لباس بے شک دیدہ زیب ہے، لیکن یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ اس سے مقصود صرف ملبوس کے حُسن کو اُجاگر کرنا ہے۔ خود قرآن میں قرآن پر مخالفین کے جن اعتراضات کا ذکر ہے، ان میں سے بیشتر معانی و مطالب سے متعلق ہیں۔

الغرض یہ کتاب جس پیغام کی حامل ہے، وہ عالم گیر اور ابدی ہے۔ عرب و عجم ہر ملک اور ہر زمانے کے لئے اس کی تحدی برقرار ہے۔ عقلِ سلیم اس پیغام کو سُن اور سمجھ کر اس کی حقانیت کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتی اور یقین کر لیتی ہے کہ وہ ہمہ گیر زمان و مکاں دونوں کی قید سے آزاد اور ہر قسم کی انفرادی، قومی، جنسی، نسلی خود غرضی سے پاک و برتر ہے۔ یہ نقطۂ نظر جو اس اخلاقی پیغام میں نمایاں ہے، صرف اسی ذات کا حق ہے جس نے قوانینِ فطرت وضع کئے۔ مادی دنیا میں جو نوامیسِ فطرت کارفرما ہیں، وہ اور انسان کی فکر و عمل کے لئے قرآن جو نظام، عقیدہ و شریعت پیش کرتا ہے، وہ دونوں اس اہم خصوصیت سے ممتاز ہیں۔ اس خصوصیت میں دونوں کا اشتراک ہی وہ چیز ہے، جس کی بدولت اسلام دینِ فطرت ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔

کائنات ساری کی ساری 'مسلم' ہے۔ یعنی ہر ذرہ خالق کے وضع کردہ قانون کا پابند ہے۔ کسی کو سرِ مُو تجاوز کرنے کی تاب نہیں لیکن کائنات کا یہ اسلام اضطراری ہے، اسی لئے ثواب و عقاب کے دائرے سے خارج ہے۔ البتہ ہر اس انسان کے لئے جو حس اور عقل رکھتا ہے، ایک بڑا موثر سبق ہے۔ یہ سبق ایسا ناگزیر ہے کہ جب تک "دل اور کان پر مہر نہ لگی ہو اور آنکھ پہ پردہ نہ پڑا ہو" اس سے تغافل اور انکار انسان کے لئے ممکن ہی نہیں۔ انسان کے لئے یہ امتحان ہے کہ وہ اختیاری طور پر مسلم ہو یعنی اس بات کو پہچانے جس میں نظامِ فطرت اور نظامِ اخلاق کے سرچشمے ملتے ہیں۔ ایسا کرنے ہی سے انسان اپنے آپ سے، انسانیت سے اور فطرت سے، اور ان سب کے واحد خالق و مدبر سے ربط و ہم آہنگی پیدا کر سکتا ہے۔ اسی کا نام صلاح اور فلاح ہے۔ اور اس کی ضد فساد ہے۔

ان سب کی مخاطب کون سی 'عقل' ہے؟۔ وہ عقل جو مدرسہ و مکتب میں پرورش پاتی ہے، یا وہ عقل جو پیدائش کے وقت ہی سے ہر انسان کا مابہ الامتیاز ہوتی ہے۔ جو کسی بھی دو انسانوں میں قدر

مشترک ہوتی ہے اور جس کے ناپید ہونے کی وجہ سے ایک انسان مجنون کہلانے لگتا ہے۔ اسلام کا دعویٰ ہے کہ اس کی مخاطب عقل کی وہ قدر اولیٰ ہے، جو انسانیت کا جوہر ہے۔ جو انسان کو انسان بناتی ہے۔ یعنی انسان محض ان فطری صلاحیتوں، جبلی طاقتوں اور غریزی قوتوں کی بنا پر جو اس میں خدا کی طرف سے ودلیعت ہوتی ہیں، اس بات کا مکلف ہے کہ اجمالی اور بنیادی اسلام تک اپنا راستہ تلاش کرے۔ وہ اسلام جو مخصوص اعمال اور روزمرہ کی عبادات کا نام نہیں، بلکہ وہ ایک خاص انداز فکر ہے اور نظام ہائے کائنات میں انسان کے مرتبے اور مقصودِ حیات سے متعلق ایک مخصوص نقطۂ نظر ہے۔ یہی نقطۂ نظر اور اندازِ فکر وہ "فطرت" ہے، جس کو لئے ہوئے ہر بچہ پیدا ہوتا ہے اور جس سے اس کا غیر اسلامی ماحول اس کو ہٹا دیتا ہے۔

اب ذرا اس پر غور کیجئے کہ اسلام کس طرح ظہور میں آیا؟

محمد صلعم ہر لحاظ سے بشر تھے۔ ان کو خدا کی طرف سے قرآن ملا اور انہوں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ساری انسانیت کے روبرو رکھ دیا، لیکن اہم سوال یہ ہے کہ انسانیت نے محمد صلعم کی شخصیت سے مرعوب ہو کر قرآن کو بغیر سوچے سمجھے قبول کر لیا یا پہلے قرآن کو سمجھا اور اس کی حقانیت سے متاثر ہونے کے بعد محمد صلعم کی پیغمبری کا اعتراف کیا؟۔

قرآن میں دو باتوں پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اور جا بجا اُن کی اتنی تکرار کی گئی ہے کہ اگر مذکورہ بالا سوال ذہن میں نہ ہو تو اصرار و تکرار کی وجہ سمجھ میں نہیں آسکتی۔ پہلی بات ہے محمد صلعم کی بشریت کا اثبات اور دوسری یہ حقیقت کہ قرآن خود اپنی حقانیت کا معیار ہے۔

اس کا پس منظر یہ ہے کہ سابق میں جو نبی آئے اُنھوں نے مفتی محمد عبدہٗ کی اصطلاح میں "اِدھاش"[1] یعنی حیرت زدہ کرنے کا طریقہ اختیار کیا۔ اُنھوں نے پہلے اُمت کو اپنی شخصیت سے اچنبھے میں ڈال دیا۔ معجزات اور خوارق عادت کا مظاہرہ کر کے اس بات کا اعتراف کرایا کہ وہ خدا سے ایسا رشتہ رکھتے ہیں، جس سے اُنہیں مافوق الفطرت طاقتوں پر غلبہ حاصل ہے۔ اس وقت انسان ذہنی ارتقار کی جس طفولیت کی منزل میں تھا، اُس میں وہ معقولیت سے متاثر ہونے کی چنداں صلاحیت نہیں رکھتا تھا،

---

[1] رسالۃ التوحید (۱۳۷۰ھ)، ص۶

بلکہ مافوق الفطرت کے آگے سر جھکاتا۔ یوں کہنا چاہیئے کہ ڈنڈے کے زور سے اطاعت کرنا ہی اس کی طبیعت کا اقتضا تھا۔ اس کے بعد گو یہ امر خود انبیاء کی تعلیم کے کتنا ہی خلاف کیوں نہ ہو لیکن اس کا تدارک واقع میں بڑا ہی مشکل ثابت ہوا کہ انبیاء کو انسانوں میں ممتاز ہی نہیں بلکہ انسانیت کی سطح ہی سے بلند و بالا رکھ دیا گیا۔ غرض یہ کہ سابق انبیاء نے پہلے اپنے برحق ہونے کا اعتراف کرایا۔ پھر عبادات اور "کرو اور نہ کرو" کے احکام کا ایک مجموعہ اپنی اُمت کو دیا۔

لیکن خاتم الانبیاء کی بعثت کے وقت انسانیت اس منزل سے بہت آگے بڑھ چکی تھی جس کا خود انسانیت کو پوری طرح احساس نہ تھا۔ پُرانا سماجی نظام اور اس سے بڑھ کر پُرانا اندازِ فکر اس احساس کے اُبھرنے میں مانع تھا۔ انسان بار بار اسی ڈگر پہ لوٹ جانا چاہتا تھا کہ پیغام کو نہ سمجھے اور پیغام بر کو مافوق الفطرت طاقتوں کا مظہر دیکھ کر اس کے آگے سرنگوں ہو جائے۔

محمد صلعم سے متعلق جو بات سب سے زیادہ قابلِ لحاظ ہے، وہ اُن کی دعوت کا طریقہ کار ہے۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ توحید کوئی نئی چیز نہیں تھی لیکن اسلام میں یہ عقیدہ جس ہمہ گیر وسعت کے ساتھ ظہور میں آیا، اور اس سے فکر و نظر میں جو عظیم الشان انقلابی نتائج برآمد ہوئے، وہ بڑی حد تک اس طریقہ کار کے مرہون منت تھے، جو پیغمبرِ اسلام کا طرۂ امتیاز ہے۔ قرآن کے صفحات ان معجزوں کی تفصیل سے بھرے پڑے ہیں، جو حضرت موسیٰ و حضرت عیسیٰ اور دیگر انبیاء سے ظہور میں آئے۔ جا بجا اس کا بھی ذکر ہے کہ محمد صلعم سے کہا جاتا تھا کہ "اگر تمہارے اشارے پر پہاڑ چل پڑیں اور آسمان ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گرنے لگے تو ہم تم پر ایمان لے آئیں گے۔" ہر موقع پر محمد صلعم کی طرف سے جو جواب دیا گیا، وہ اس کے علاوہ اور کچھ نہ تھا کہ "میں تم جیسا ہی بشر ہوں۔ بندہ ہوں اور رسول ہوں۔ تم تک پیغام پہنچاتا ہوں۔ اس پیغام کو سُنو اور سمجھو۔ اپنے حواس اور دل و دماغ کی طاقتوں سے کام لو۔ جب تمہیں اس پیغام کی حقانیت کا یقین ہو جائے گا، تو میرے سچے ہونے میں بھی تمہیں کوئی شک نہیں رہے گا۔ یہی میرا معجزہ ہے۔" الغرض اسلام نے رسالت کا جو تصور پیش کیا، یعنی ایسی رسالت جو عقل کو سُلانے یا مرعوب کرنے کے بجائے اُسے بیدار کرے اور اس سے مانوس ہو، وہ درحقیقت انسانیت کے لئے ایک بالکل نئی چیز تھی۔

اب تاریخی حیثیت سے دیکھیئے کہ جن لوگوں نے محمد صلعم کی دعوت پہ لبیک کہا، اُن کا رسول اللہ

کی تصدیق کرنا کس نوعیت کا عمل تھا؟ سب تسلیم کرتے ہیں کہ روایتی، سماجی، اقتصادی اور جذباتی مؤثرات محمد صلعم کی دعوت کے خلاف تھے۔ ایسے حالات میں ان کا اسلام لانا ایک محض فکری اور ذہنی انقلاب کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ لوگ جانتے تھے کہ ایک یتیم اور اُمی لیکن امین اور خوش خلق انسان جو کھاتا پیتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، یہ سارا انقلاب صرف قرآن وعظ ونصیحت، افہام وتفہیم کے ذریعہ برپا کر رہا ہے۔ الفاظ میں ایسے اثر تھا کہ وہ انسان کو جان ومال کی قربانی کے لئے آمادہ کر دے۔ باپ کو بیٹے اور بیٹے کو باپ سے، شوہر کو بیوی اور بیوی کو شوہر سے اور بھائی کو بھائی سے جدا کر دے۔ اور اس قبائلی نظام معیشت کو جو عربوں کے نزدیک قریب قریب مقدس تھا، درہم برہم کر دے۔ نیز اس قومی نخوت وپندار کو جو مادی وسائل کی کمی اور بے علمی وبے تمدنی کے باوجود عربوں کے رگ وپے میں سرایت کیے ہوئے تھا، ضرب کاری لگا دے۔

کیا یہ اثر اس وجہ سے ہو سکتا ہے کہ الفاظ کا مفہوم انسانی عقل وفہم کے لئے قابل قبول ہے اور انسان کو تعلیم دیتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو بھول کر نہیں بلکہ اپنے آپ کو پہچان کر اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنے رب کو پہچانے؟ یہ وہ چیز تھی جس سے ابھی تک دنیا نامانوس تھی۔ عام طور سے خیال کیا جاتا تھا کہ ایک انسان ایسا صرف اسی وقت کر سکتا تھا جب وہ کسی مافوق الفطرت طاقتیں رکھنے والی شخصیت کے زیر اثر آ جائے اور ایک حد تک اپنا ارادہ واختیار کھو بیٹھے۔ اسی لئے لوگوں کو ایمان لاتے دیکھ کر سب سے پہلے جو بات محمد صلعم کے مخالفین کی زبان پر آئی، وہ یہ تھی کہ محمد صلعم ساحر اور جادوگر ہیں۔ شاعر ہیں۔ کاہن ہیں۔ مجنون ہیں۔ جادو کی بات، سب ہی جانتے ہیں کہ اس کا اثر عقل کی بیداری کا مرہونِ منت نہیں، بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔

شاعر کو عربوں کی قبائلی زندگی کے نظام میں بڑا اثر ورسوخ حاصل تھا۔ اس کا کلام گہرا اثر رکھتا تھا اور بیشتر اوقات بادشاہوں اور با اقتدار ہستیوں کے احکام اور ارادوں سے زیادہ قوی اور کارگر ثابت ہوتا تھا۔ اس اثر کو بھی عرب مافوق الفطرت طاقتوں کا مرہونِ منت سمجھتے تھے اور اُن کا عقیدہ تھا کہ ہر شاعر کے ساتھ ایک سرپرست مصدر الہام جن یا شیطان ہوتا ہے۔

ہمارے نقطۂ نظر سے قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ عرب کے جاہلی شاعر گو وہ الفاظ اور کلام کے ذریعہ اثر پیدا کرتے تھے، لیکن اُن کا کلام ایسے مفہوم ومعانی سے خالی ہوتا تھا، جو انسانی عقل کے آگے

بڑھنے اور صحیح اخلاقی قدروں کو تلاش کرنے اور ان کو جانچنے اور پرکھنے میں مدد معاون ہوں۔ وہ صرف ان جاہلی اخلاق کا ڈنکا بجاتے تھے، جن کو وہ "مروّۃ" کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے۔ یہ اخلاق محض روایتی اور اندر سے بالکل کھوکھلے تھے۔ ان کی تہہ میں اخلاقی قدروں کا احساس نہیں پایا جاتا تھا۔ آج بھی اس شاعری کے جو نمونے پیشِ نظر ہیں، اُن میں انسانی فکر کو بلند کرنے والی کوئی چیز نہیں ملتی۔ اس کے جس حصے کو "حکمیات" کہا جاتا ہے، اس میں اس زمانے اور اس مخصوص ماحول میں روزمرّہ کی زندگی کے چند تجربات کے سوا کچھ نہیں۔ الغرض عرب قرآن کو بھی شاعری سمجھتے تھے۔ باوجودیکہ اس کا قالب شعر کا نہیں۔ اصل میں وہ قرآن کی دعوتِ فکر و نظر سے تجاہل کرنا چاہتے تھے۔

کہانت ایسا نظام ہے، جس کا انسانیت صدیوں سے شکار چلی آتی تھی۔ اس کا انسان کی فطری اور عقلی نشو و نما پر جو اثر پڑتا ہے، وہ محتاجِ بیان نہیں۔ محمد صلعم نے ساحر ہونے سے انکار کیا۔ شاعری کی تہمت کو بڑے شد و مد کے ساتھ ردّ کیا۔ "شعراء کی پیروی صرف گمراہ لوگ کرتے ہیں یعنی وہ لوگ جو ہر وادی میں سرگرداں پھرنے والے شعراء کی طرح اخلاقی قدروں کو جانچنے اور پرکھنے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں"۔ کہانت کی بھی نفی کی اور جنون سے بھی بیزاری کا اعلان کیا۔

مختصر یہ کہ میں جو کچھ کہتا ہوں، وہ ایک سادہ بات ہے۔ اس انداز کی جیسی کہ ایک معمولی انسان دوسرے انسان سے کرتا ہے۔ اور اس دعوت کا دار و مدار اس اعلان پر تھا کہ تم سنو، سمجھو اور سوچو۔ چناں چہ یہی ہوا کہ جنہوں نے محمد صلعم کی سچائی کی شہادت قرآن کے علاوہ کسی خارق عادت میں تلاش کی، وہ محروم ہی رہے۔ اس کے برخلاف جنہوں نے تدبر سے کام لے کر محمد صلعم کی بات پہ کان دھرا، انہوں نے ایک ایسا ذہنی انقلاب محسوس کیا، جس نے اُن کی ساری زندگی کی کایا پلٹ دی۔

اوپر جو کچھ کہا گیا، اس سے مقصود یہ واضح کرنا تھا کہ کسی کا دینِ اسلام کو اختیار کرنا اس طریقہ کار کے پیشِ نظر جو محمد صلعم کا طرۂ امتیاز تھا، ایک ذہنی انقلاب کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ آج بھی اگر ایک مسلم غیر مسلم کو دعوتِ اسلام دے تو اِن دونوں میں کیا چیز قدرِ مشترک ہو گی؟۔ یقیناً ان دونوں میں قدرِ مشترک وہی فطری عقل اور سمجھ ہو گی جس کے بغیر کوئی دو انسان ایک دوسرے سے بات تک نہیں کر سکتے۔ اس کے علاوہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کو حیرت زدہ کر دے۔ اس کی عقل اور سمجھ کو بے کار کر کے کوئی بات منوالے۔ چناں چہ آج بھی انسانیت کے

کئی گروہ عوام کی توہم پرستی پر اپنا وجود قائم رکھے ہوئے ہیں لیکن ایسا طریقہ کار قطعاً غیر اسلامی ہے۔ محمد صلعم کے ہاتھ پر جو سابقین اولین ایمان لائے، وہ سب ایسے تھے جنہوں نے محمد صلعم کی تعلیمات سے اپنے اندر ایک ذہنی انقلاب محسوس کیا۔ ایسا تو بہت ہوا کہ لوگوں نے محمد صلعم کی دیانت داری، عدل و انصاف، کرم اور خوش خلقی کی مثالیں دیکھیں اور اُن کی بدولت اسلام کی حقانیت کو پہچانا، لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کوئی اس لئے اسلام لایا ہو کہ اُس نے محمد صلعم کو مُردے میں جان ڈالتے دیکھا۔

ابتدائی دَور کی مکی آیتوں سے جن میں بیشتر خدا کے وجود اور اُس کی وحدانیت کی دعوت دی گئی ہے، صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی مخاطب انسان کی فطری عقل ہے۔ اور اس کے علاوہ اور ہو بھی کیا سکتا تھا۔ ان آیات کے مخاطب وہ لوگ تھے، جو ابھی تک محمد صلعم کی رسالت کے منکر تھے اور محمد صلعم کی سند پر کوئی بات تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے تھے۔ جن لوگوں نے اپنی فطری عقل سے اس بنیادی دعوت کی حقانیت کو سمجھا، اُنہوں نے محمد صلعم کو اپنا ہادی اور رہبر مانا اور اس کے بعد سے (لیکن اس کے پہلے نہیں) محمد صلعم کی بات اُن کے لئے سند قرار پائی۔

بہرحال رسول اللہؐ کے انتقال کے بعد خالص طبیعی مسائل تو ایک طرف رہے، آئے دن ایسے دینی اور دنیوی، اقتصادی، اجتماعی اور سیاسی مسائل سے دوچار ہونا پڑا جن میں ایک مسلمان دین کے احکام کا محتاج تھا۔ اور کوئی صریح حکم اُسے نہ ملتا تھا۔ رسول نے صرف اُن مسائل کی بابت احکام بتائے جو واقعتاً اُن کی زندگی میں پیش آئے مستقبل کے حالات کا اجمالی یا تفصیلی تصور کرنا اور فرضی اور امکانی مسائل کی بابت ھدایات چھوڑنا رسولؐ کی عادت کے بالکل خلاف تھا۔ بلکہ بیش تر اوقات پوچھنے اور سوال کرنے پر بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسولؐ نے قصداً بندھے ٹکے احکام صادر کرنے سے اعراض کیا۔ پھر حجۃ الوداع کے موقع پر یہ اعلان کر دیا گیا کہ "آج ہم نے تمہارے لئے تمہارے دین کی تکمیل کر دی"۔ اس سب کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ایک ایسی قوت کو بروئے کار لایا جائے، جو بتائے ہوئے دینی احکام کی روشنی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نئے حالات اور بڑھتی ہوئی ضروریات کا صحیح حل دریافت کرنے کی ذمہ داری لے سکے۔ یہ قوت عقل کے سوا اور کون سی ہو سکتی تھی؟۔